یادِ رفتگاں
قسط ۱

حافظ محمد ابراہیم فانی
مدرس دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک

سیرِ بوستاں

شیخ القرآن والحدیث مولانا عبدالہادی صاحب شاہ منصوری قدس سرہ

اتفاقِ بلبل و گل بارہا خواہد شدن
درمیانِ ما شما و سیرِ بوستاں یا نصیب

آج رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ کی ۲۴۔ اور ستمبر ۱۹۷۷ء کی ۸ تاریخ ہے۔ شاہ منصور گاؤں کی وسطی جامع مسجد میں معمول سے زیادہ علماء و فضلاء اور طلباء و مشائخ کا بے پناہ ازدحام اور ہجوم ہے۔ ہر ایک چہرے پر خوشی اور غم کے ملے جلے آثار نمایاں ہیں۔ خوشی اس بات کی کہ آج ختم دورہ تفسیر قرآن ہے۔ اور غم اس کا کہ ایک مبارک محفل اور پرکیف بزم سے جدائی کا وقت آیا ہے۔ یہی سلسلہ تو سالہا سال سے جاری تھا لیکن اب کے دفعہ کچھ اور ہی انداز تھا۔ وہ یوں کہ آج سے دو دن قبل حضرت شیخ القرآن صاحب پر بیماری کا شدید حملہ ہوا تھا اور انہوں نے دو دن سبق بھی نہیں پڑھایا تھا۔ آج بھی ہر ایک طالب علم چشم براہ تھا اور ساتھ ساتھ پریشان بھی۔ کہ آیا حضرت الشیخ اس اختتامی تقریب میں شرکت کر سکیں گے یا نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی غیر موجودگی کی صورت میں محفل کا رنگ پھیکا ہوگا۔ ابھی سبق شروع ہونے کو چار پانچ منٹ باقی تھے کہ حضرت شیخ القرآن صاحب انتہائی ضعف و نقاہت اور تکلیف کی حالت میں مسجد کے دروازے تک لائے گئے۔ پھر دو افراد کے سہارے آپ اپنی نشست تک تشریف لائے۔ اور جلوہ افروز ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولانا نورالہادی صاحب نے پارہ عم کی تفسیر نصف آخر سے شروع کی۔ پھر جب آپ نے سورہ لہب تک تفسیر ختم کی تو مائیک حضرت الشیخ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے مخصوص انداز میں پہلے درود شریف پڑھا۔ پھر سورۃ اخلاص کی تفسیر شروع کی۔ مسجد (جو کہ اندر اور باہر کھچا کھچ بھری ہوئی تھی) سے آہستہ آہستہ آہوں اور سسکیوں کی آوازیں شروع ہوئیں۔ ہر ایک آنکھ پر نم اور ہر چشم اشکبار تھی۔ خود بندہ کے دل کا یہ عالم تھا کہ بقول حافظ شیرازی ؎

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

ایسی ہی کیفیت سے وہاں پر موجود ہر شخص دوچار تھا۔ آپ نے اس شدید بیماری کے باوجود ان تینوں سورتوں کی تفسیر بیان فرمائی۔ لیکن ہر ایک دل، ہر آنکھ اور ہر نفس ایک عجیب درد و کرب میں مبتلا تھا۔ ختم تفسیر قرآن کے بعد آپ نے اختتامی کلمات اور نصائح سے طلباء کو نوازنا شروع کیا۔ گلوگیر آواز میں ہجر و فراق پر مشتمل اشعار سنائے۔ کئی دفعہ آپ کی سانس رک جاتی چنانچہ اس وقت جو اشعار سنائے وہ بندہ کے نوک زباں ہیں۔ اور جب بھی یاد آجاتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے وہی نقشہ رقصاں نظر آتا ہے اور دل کی دنیا میں پھر سے ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آہ کس درد بھرے الفاظ اور انداز میں یہ اشعار سنائے ؎

اتفاقِ بلبل و گل بار ہا خواہد شدن
درمیانِ ما شما و سیرِ بوستان یا نصیب
چونکہ گل گشت و گلستاں در گذشت
نشنوی زیں پس ز بلبل سر گذشت
چونکہ گل گشت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از کے جوئیم از گلاب
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

فرمایا۔ کہ پھر کیا معلوم۔ یہ محفل دوبارہ سج جائے گی یا نہیں۔ تشنگانِ علوم نبوی کی یہ کہکشاں پھر فروزاں و منور نشاں ہوگی یا نہیں۔ فرمایا۔ درمیان ما شما و سیر بوستاں یا نصیب۔ پھر فرمایا۔ درمیانِ ما شما و سیر بوستاں۔ تو کافی دیر تک خاموش رہے۔ حافظ فضل دیان صاحب نے شعر پورا کیا۔ اور کہا یا نصیب۔

بندہ کے ساتھ قریب ہی افغانستان کا ایک سفید ریش بیٹھا تھا اس کی حالت انتہائی خراب اور دگرگوں تھی۔ زور زور سے رو رہا تھا اور پھر آخر میں بے ہوش ہوگیا۔ وہ تقریباً تیس سال سے مسلسل اس دورۂ تفسیر میں شریک ہوتا رہا۔

ویسے تو راقم سطور کئی سال سے اس دورۂ تفسیر کی اختتامی تقریب میں شرکت کرتا رہا لیکن اس سال ۱۹۷۷ء کو باقاعدہ طور پر تمام دورۂ تفسیر میں شرکت کی۔ یہ دورۂ تفسیر کی برکت ہے کہ شاہ منصور جیسا مختصر قصبہ رمضان شریف میں ایک پر کیف و پر اثر، روح پرور سماں پیش کرتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چھوٹے اور بڑے مرد اور عورتیں تمام قرآن پاک کے ترجمے و تفسیر سے اس قدر لذت آشنا اور مانوس ہو چکے ہیں کہ اس قصبہ میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جن کو قرآن پاک باترجمہ پڑھنا نہ آتا ہو۔ ایک دفعہ بندہ درس کے اختتام پر جب مسجد (مسجد قاسم خیل) میں اس

وقت راقم سطور مقیم تھا) آیا۔ تو وہاں ایک بوڑھے زمیندار نے مجھے کہا۔ کہ میں آپ کے پانچ منٹ ضائع کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا۔ فرمائیے! اس نے کہا کہ میرے بیٹے کے نام آپ ایک تعزیتی خط لکھیں۔

میں نے عرض کیا۔ بسر وچشم۔ میں نے قلم اور کاغذ لیا اور اس سے کہا کہ آپ بتاتے جائیں۔ میں لکھتا جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے قرآنی آیات سے مرقع اور مرصّع ایسا تعزیتی مضمون سنایا کہ میری حیرت اور استعجاب کی انتہا نہ رہی اور اس سوچ میں غلطاں رہا کہ ایک دیہاتی ان پڑھ شخص اس قسم کے تعزیتی کلمات سنا سکتا ہے۔

یہ حضرت الشیخ کی برکت تھی کہ رمضان المبارک میں شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن کا پورا لطف شاہ منصور میں محسوس ہوتا تھا۔ اور آج بھی اس قریہ کی فضا میں ان انفاسِ قدسیہ کی خوشبو اور مہک رچی بسی ہے بقول لسان الغیب[۱] حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

نامِ من رفت است روزے برلبِ جاناں بسہو
اہلِ دل را بوئے جاں می آید از نامم ہنوز

---

[۱] حافظ شیرازی رحمۃ اللہ عموماً لسان الغیب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس لقب کے بارے میں مولانا عبدالرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو لسان الغیب اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ان کے کلام میں تکلف و تصنع بالکل نہیں اور یہ آمد سوائے تائید غیبی اور القا کے ممکن نہیں۔ جب کہ مولانا آزاد بلگرامی کا خیال ہے کہ حافظ کو لسان الغیب کا لقب اس واسطے دیا گیا ہے کہ اکثر خوش اعتقاد لوگ اس سے فالیں نکالتے ہیں۔ اور وہ اکثر صحیح نکلتی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں بہت دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مہر گم ہوگئی چونکہ وہ بہت قیمتی تھی اور ہیرے جواہرات اس میں لگے ہوئے تھے، علاوہ ازیں اس کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر یہ کسی شخص کے ہاتھ لگی اور اس کو غلط طریقے سے استعمال کی گئی تو حکومت کو بہت بڑا نقصان ہوگا۔ چونکہ عالمگیر کو خواجہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ اس سے فال نکالنے اور دیکھنے کی غرض سے دیوان حافظ اٹھایا اور کنیز کو پکارا کہ چراغ لے کر آؤ۔ وہ چراغ لے کر آئی۔ انہوں نے دیوانِ حافظ کھول کر دیکھا تو یہ شعر نکلا ؎

بفروغ چہرہ زلفت ہمہ شب زند رہ دل | چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

انہوں نے کنیز کی تلاشی لی اور وہ اس کی کمر سے برآمد ہوئی۔

ہمایوں بادشاہ بھی دیوانِ حافظ سے فال نکال لیا کرتا تھا۔ ایران سے فوج لے کر جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو دیوان سے فال نکالی۔ یہ شعر نکلا ؎ (باقی اگلے صفحہ پر)

جن حضرات نے یہاں پر رمضان شریف کے سرور آگیں لمحات کا مشاہدہ کیا ہے ان کو تو بخوبی علم ہے لیکن جنہوں نے اس پرکیف منظر کو نہیں دیکھا اور اس کی روحانی کشش سے لذت آشنا نہ ہوئے ہوں۔ ان کے لئے مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے یہ الفاظ شاید کچھ سامانِ تسکین کر سکیں۔ انہوں نے اپنے اس روح پرور عبارت میں دینی و روحانی مرکزوں میں رمضان کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے جس کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو حضرت الشیخ کے ہاں رمضان کا کچھ یوں ہی عالم تھا۔ لکھتے ہیں :-

" رمضان المبارک کے آتے ہی دینی و روحانی مرکزوں اور خانقاہوں کی فضا بدل جاتی تھی۔ ان لوگوں کے علاوہ جو یہاں پر مستقل قیام پذیر ہوتے تھے۔ شیخ و مرشد سے بیعت و عقیدت کا تعلق رکھنے والے دور دور سے اس طرح کھنچ کھنچ کر آجاتے تھے جیسے آہن پارے مقناطیس کی طرف اور پروانے شمع کی طرف آجاتے تھے یہ روحانی مرکز و تلاوت اور نوافل و عبادات سے اس طرح معمور ہو جاتے کہ گویا دن میں اس کے سوا کوئی کام اور رمضان کے بعد کوئی رمضان آنے والا نہیں۔ ہر شخص دوسرے شخص سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا۔ اور رمضان کے ہر دن کو صرف رمضان ہی کا نہیں زندگی کا آخری دن سمجھتا۔ اور خواجہ میر درد کے اس شعر کی سچی تصویر اور عملی تفسیر بن جاتا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جس قدر بس چل سکے ساغر چلے

جو خدا کا بندہ تھوڑی دیر کے لئے اس ماحول میں آجاتا تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ افسردہ طبیعتوں میں نئی گرمی بلکہ سرگرمی پست ہمتوں میں عالی ہمتی اور اولوالعزمی بلکہ مردہ دلوں میں زندہ دلی اور بلند پروازی پیدا ہو جاتی : بجلی کا ایک کرنٹ تھا جو کہ دلوں سے دلوں کی طرف پہنچ جاتا اور مردہ دلوں میں ایک تجلی پیدا کر دیتا۔ جو شخص اس ملکوتی فضا کو دیکھتا۔ اس کا قلب شہادت دیتا۔ کہ جب تک خدا طلبی کا یہ ہنگامہ برپا ہے۔ اور دین و روحانیت کی شمع کے پروانوں کا ہجوم ہے اور ہر قسم کے دنیوی اغراض اور نفس پرستی و دنیا طلبی سے بالاتر ہو کر خدا کو راضی کرنے اور اپنی آخرت کو بنانے کے لئے اتنے آدمی کسی جگہ جمع ہیں دنیا تباہ نہ ہوگی۔ اور زندگی کی اس بساط کو تہہ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

وہ بے اختیار خواجہ حافظ کے الفاظ میں اس طرح گویا ہو جاتا تھا ؎

از صد سخنِ پیرم یک نکتہ مرا یاد است ‏ ‏ عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است[1]

بقیہ گذشتہ صفحہ ؎ عزیزِ مصر بر غم برادرانِ غیور ‏ ‏ ز قعرِ چاہ بر آمد بہ اوج ماہ رسید (فانی)

بالآخر کئی لڑائیوں کے بعد ہندوستان پر قابض ہوا۔ اس سلسلے میں بندہ کے اپنے بھی کچھ تجربات ہیں

[1] سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ ص ۱۲۳

مولانا ندوی کے اس طویل اقتباسات سے مقصد رمضان شریف میں ان روحانی مراکز کی روح پرور فضاؤں کی دل آویزی کا نقشہ دکھانا تھا البتہ انہوں نے صرف خانقاہوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ کے یہ الفاظ شاہ منصور میں محفل تفسیر قرآن پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ جب پندرہ شعبان کو پوری روحانی آب وتاب کے ساتھ یہ بزم قدسی سج جاتی اور ۲۴ر رمضان المبارک تک قائم رہتی۔

قبل اس کے کہ ہم اپنے اصل عنوان کی طرف رجوع کریں اور حضرت الشیخ کے حالات زندگی پر کچھ لکھیں ضروری ہے قصبہ شاہ منصور کے "تاریخی پس منظر" پر روشنی ڈالیں کہ طلبہ علم دین و علماء اور مشائخ و صلحاء کا یہ مرکز کس سن میں آباد ہوا۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ شاہ منصور کون تھا؟

شاہ منصور:۔ ملک سلیمان شاہ اور سلطان شاہ جو کہ پٹھانوں کے مشہور قبیلہ یوسف زئی سے تعلق رکھتے تھے یہ دونوں بھائی ملک تاج الدین بن ملک رزڑ کے بیٹے اور نہ صرف قبیلہ یوسف زئی کے سردار اور ملک تھے بلکہ تمام اقوام خخی یا خشی دیوسف زئی۔ گگیانی۔ ترکلانی بشمول محمد زئی) کے سرداروں اور ملکوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تواریخ حافظ رحمت خانی کے مطابق یوسف زئی مقام گاڑہ اور نوشکی میں اور غوریا خیل خصوصاً خلیل ترنک منفر اور قرہ باغ میں آباد تھے کسی سبب سے ان دونوں قبیلوں میں آپس میں لڑائی ہوگئی۔ غوریا خیل نے سارے خشی کو شکست دی اور یہ ملک ان سے چھین لیا۔ چنانچہ کل خخی (خشی) اپنے قبائل کے ساتھ وہاں سے کوچ کرکے نشیب کی طرف چل کر کابل آگئے۔ اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ رفتہ رفتہ یوسف زئی کابل کے نواح میں بہت بڑے دبدبے اور شوکت کے مالک ہو گئے۔ اور کابل کے مضافات کے تمام حدود اپنے زیر تصرف لے آئے۔

قاضی عطاء اللہ صاحب اپنی مشہور تالیف "د پختنو تاریخ" میں لکھتے ہیں:۔

یوسف زئی اس ملک میں چار سو سال سے کچھ زیادہ مدت سے یہاں آباد ہیں یہ قوم گارہ اور نوشکی کے اصل باشندے ہیں۔ نوشکی سیستان کے علاقے میں دشت لوط کے کنارے واقع ہے۔ یہ قبیلہ درحقیقت پٹھانوں کی خشی قوم کی ایک شاخ ہے۔ جس کی اور شاخیں گگیانی۔ ترکلانی اور محمد زئی تھے۔ تقریباً ۳۰۰ھ کے اواخر اور ۴۰۰ھ کے آغاز میں یہ چاروں قبیلے دیگر اقوام کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اس علاقے سے نکال دئے گئے۔ وہاں سے آکر یہ لوگ خراسان اور کابل کے گرد و نواح میں آباد ہوئے اور رفتہ رفتہ انہوں نے یہاں پر کافی اثر و رسوخ پیدا کیا۔

مرزا الغ بیگ:۔ یہ مرزا ابوسعید کا بیٹا اور تیموری خاندان کے ساتھ اس کا تعلق تھا۔ بلکہ امیر تیمور کے پوتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ تیمور تک اس کا شجرہ یوں ہے:۔

الغ بیگ مرزا۔ ابن ابوسعید مرزا۔ ابن سلطان محمد مرزا۔ ابن میران شاہ مرزا۔ ابن امیر تیمور

"تاریخ پشتون کے مطابق جب سلطان ابوسعید مرزا ہرات میں شہید ہوا تو اس وقت اس کے گیارہ لڑکے تھے۔ سلطان احمد

مرزا۔ الغ بیگ مرزا۔ سلطان عمر مرزا۔ مرزا شاہ رخ، عمر شیخ مرزا۔ سلطان مراد مرزا۔ سلطان خلیل مرزا۔ اور سلطان مرزا۔ بقیہ تینوں کے نام درج نہیں) ان میں سے چار بادشاہ ہوئے۔ اور اپنے باپ کے عہد میں مختلف مملکتوں میں بادشاہت کرتے رہے۔ الغ بیگ مرزا کابل میں۔ سلطان احمد مرزا سمرقند میں۔ سلطان محمد مرزا حصار، قندز اور بدخشاں میں۔ اور عمر شیخ مرزا اندجان اور فرغانہ میں۔

لیکن تاریخ پشتون کے اس اقتباس کے برعکس قاضی عطاء اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

کافی زمانے سے کابل پر تیموری خاندان کی حکومت تھی۔ لیکن جب مرزا ابوسعید کا انتقال ہوا تو کابل کی بادشاہت ان سے چلی گئی ـــ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا الغ بیگ اپنے والد کے زمانہ میں کابل کے حکمران نہ تھے۔

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ یوسف زئی قبیلے کے لوگ یہاں کابل میں آباد ہو گئے اور انہوں نے کافی اثر ورسوخ پیدا کیا تھا۔ اس لئے جب مرزا الغ بیگ کو کابل پر حکمرانی کا خیال آیا۔ تو انہوں نے قبیلہ یوسف زئی کے ساتھ مل کر کابل کی حکمرانی کا مہم سر کیا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا الغ بیگ چند مغلوں کے ساتھ ماوراء النہر سے انتہائی کم عمری میں شکستہ حال و پریشان خاطر یہاں آیا تھا۔ ملک سلیمان شاہ کے ساتھ اس کا تعلق پیدا ہوا۔ اور وہ اس کے ساتھ انتہائی محبت کرتا تھا اس کو بیٹوں کی طرح پالا اور اس کی تربیت کی۔

تواریخ حافظ رحمت خان کے مطابق اس پرورش اور تربیت سے سلیمان شاہ کی غرض یہ تھی کہ یہ شہزادہ ہے جب بڑا ہو جائے گا تو اس کو بادشاہ بناؤں گا۔ اس کی حکومت میری ہو جائے گی۔ اور اسی طرح خشی بالخصوص یوسف زئی صاحب جاہ ہو جائیں گے۔ ملک سلیمان شاہ نے شہزادہ کو پالا پوسا اور اس کی کما حقہ تربیت کر کے کمال تک پہنچایا بعد ازاں اسے کابل کا بادشاہ بنایا۔ خطبہ اور سکہ اسی کے نام سے جاری ہو گئے۔ ملک کو تصرف میں لے آیا۔ فوج بھی زیادہ ہو گئی اور مغل بھی اطراف وجوانب سے اکٹھے ہو گئے۔

یوسف زئی اور مرزا الغ بیگ کے درمیان اختلاف

تواریخ حافظ رحمت خانی میں لکھا ہے۔ کہ مرزا الغ بیگ جب مستقل بادشاہ بن گیا تو یوسف زئی کے بارہ میں اس کی نیت میں تبدیلی آئی۔ کیونکہ یوسف زئی ہر لحاظ سے غالب تھے۔ وہ مرزا الغ بیگ کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اپنی مرضی کے مالک اور سلیمان شاہ اور یوسف زئی جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ انہی دنوں گگیانی قوم اور یوسف زئی کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے مرزا نے سوچا کہ کیوں نہ اختلافات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ پہلے ان دونوں قبیلوں پر علیحدہ علیحدہ چڑھائی کروں گا پھر ان کو زیر کر کے اپنی حکومت کو مستحکم بناؤں گا۔

(جاری)